حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۸)

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ حضرت حجر بن عدیؓ کے قتل کو جائز ثابت کرنے میں اپنا زورِ استدلال صرف کرنے کے بعد مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یزید کی ولی عہدی کو جائز قرار دینے میں بھی بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ یہ صورتِ حال فی الواقع بڑی عبرت انگیز ہے کہ مولانا مودودی کی تردید و تغلیط کے جوش میں مولانا عثمانی صاحب کو اس امر کا احساس نہیں رہا کہ وہ اسلامی قوانین کا حلیہ کس طرح بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ پہلے انہوں نے اسلامی حکومت کی انتظامیہ و عدلیہ کی یہ تصویر ہمارے سامنے رکھی کہ اس کے ارکان جو ظلم و عدوان چاہیں، کرتے رہیں، وہ مواخذے سے بالاتر ہیں۔ پھر انہوں نے اسلامی قانونِ بغاوت اور اسلامی حقوقِ شہریت کی یہ تعبیر پیش کی کہ حکومت جس "انتشار پسند" کو چاہے باغی قرار دے اور اُسے بیان یا صفائی کا موقع دیئے بغیر اس کا سر تن سے جُدا کر دے۔ اب یزید کی ولی عہدی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بات پر اُمّت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر اپنے بیٹے یا دوسرے رشتہ دار میں نیک نیتی کے ساتھ شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اُسے ولی عہد بنا سکتا ہے اور خلیفہ کی نیت پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اور خاندانی بادشاہت دونوں اسلام میں یکساں طور پر جائز و مباح ہیں اور مسلمان ان دونوں میں سے جس طرزِ حکومت کو چاہیں اپنا سکتے ہیں۔

اسلام کا نظریۂ حکمرانی ایک ایسا اہم اور وسیع موضوع ہے کہ اس پر سیر حاصل بحث کے لیے ایک مضمون کے بجائے ایک کتاب درکار ہے۔ جب تک قرآن مجید، اُسوۂ رسالت اور اُسوۂ خلافت راشدہ کی روشنی میں اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ نہ لیا جائے، اسلام کا نظریۂ حکومت واضح نہیں ہو سکتا اور مولانا عثمانی

صاحب کے موقف کی غلطی پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ لیکن یہاں اس محدود مضمون کی تنگ دامنی میری راہ میں حائل ہے۔ تاہم میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ اس موضوع پر جو مفصل تحریریں مولانا مودودی کے قلم سے نکل چکی ہیں، انہیں ضرور پڑھیں۔ خود ان کی اسی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے ابتدائی ابواب اسی بحث سے متعلق ہیں۔ مولانا عثمانی صاحب بھی آغازِ تنقید میں ان پر اظہارِ پسندیدگی فرما چکے ہیں۔ اگر وہ بھی یادداشت تازہ کرنے کی غرض سے ان پر دوبارہ نگاہ ڈال لیں تو مضائقہ نہ ہو گا۔ اس کے بعد اس موضوع پر اب چند مزید ضروری گزارشات میں بھی پیش کروں گا۔

خلفائے راشدین کا انتخاب یہ حقیقت تو ظاہر و باہر ہے کہ اسلامی ریاست کے اولین امیر سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے منتخب کردہ یا نامزد کردہ امیر نہ تھے، نہ آپ نے اپنی سعی یا زور سے منصبِ امارت حاصل کیا تھا۔ بلکہ آنحضورؐ کو احکم الحاکمین اور رب العالمین نے خود خلعتِ نبوت سے سرفراز فرمایا تھا اور آپ کی امارت و امامت آپ کے منصبِ نبوت و رسالت ہی کا ایک جزوِ لاینفک تھی۔ آنحضورؐ کے وصال پر البتہ یہ اہم سوال پیدا ہوتا تھا کہ آپ کا خلیفہ اور مسلمانوں کا امیر کون ہو اور اس کی امارت کا انعقاد کیسے ہو؟ اسلام میں اگر سب سے بڑھ کر کسی امیر کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے کسی شخص کو اپنا جانشین نامزد کر کے اس کی بیعت اپنی زندگی میں لے تو وہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے تھے۔ آپؐ کے خاندان میں خلافت کی اہلیت رکھنے والے مفقود بھی نہ تھے۔ یہ کام اگر اسلام میں پسندیدہ کام ہوتا تو اس کی ابتدا کرنے کے سب سے زیادہ حق دار خود حضورؐ تھے۔ لیکن سب کو معلوم ہے اور اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ نے یہ کام نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنے خاندان سے باہر بھی کسی کو خلیفہ نامزد کر کے اس کی بیعت نہ لی۔ اس مسئلے میں جو مستند ترین احادیث وارد ہیں وہ اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خود آنحضورؐ اپنی جانشینی کے معاملے میں ایک گونہ فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ اس ضمن میں امت کی مناسب رہنمائی فرما دیں۔ آپ کے ارشادات سے یہ حقیقت بھی صاف طور پر مترشح ہوتی ہے کہ اگرچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضورؐ کی نظرِ مبارک میں منصبِ خلافت کے لیے اہل ترین تھے اور آپؐ کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہی خلیفۂ اول بنیں، لیکن ان جملہ امور کے باوجود آپ نے اپنے جانشین کے لیے نامزدگی (NOMINATION) کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آنحضورؐ کا وصال ایک عظیم سانحہ تھا اور اس کے بعد خلیفہ کا تقرر امت کے لیے ایک سنگین ذمہ داری اور آزمائش تھی۔ اس مسئلے میں اختلافِ رائے کا پیدا ہونا بھی ناگزیر تھا جس کے

اثرات اب تک امت میں چلے آ رہے ہیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی رائے قائم کر لینے کے باوجود صحابہؓ کرام کے سامنے اُسے ایک باقاعدہ عہد، وصیت یا تجویز کے طور پر پیش نہیں فرمایا تاکہ قدیم زمانہ سے دنیا بھر میں ولی عہد مقرر کرنے کا جو طریقہ رائج و متوارث چلا آ رہا تھا، اس پر کاری ضرب لگے اور امتِ مسلمہ اپنی ذمہ داری پر انتخابِ امیر کے جمہوری و معیاری طریق کو اختیار کرے۔ صحاح ستہ میں اس مسئلے سے متعلق متعدد احادیث مروی ہیں جن میں سے ایک کا ضروری حصہ میں بخاری، کتاب الطب والمرضیٰ سے یہاں پیش کرتا ہوں اس حدیث میں مذکور ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر شدتِ مرض طاری ہوئی تو آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

لقد هممت او اردت ان ارسل الى ابى بكر وابنه واعهد ان يقول القائلون او يتمنى المتمنون ثم قلت يأبى الله ويدفع المومنون او يدفع الله ويابى المؤمنون۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلواؤں اور ان کے حق میں ولایتِ عہد کر دوں، مبادا کہ بعد میں معترضین اعتراض کریں یا تمنا کرنے والے تمنا کریں پھر میں نے جی میں کہا کہ اللہ ان چیزوں کو روک دے گا اور مومنین ان کا دفعیہ کریں گے۔ یا دوسرے الفاظ میں اللہ دفعیہ کر دے گا اور مومنین ابا کریں گے۔

یہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ بخاری اور دیگر کتبِ صحاح کے متعدد مقامات پر وارد ہے۔ اس کا لفظ "المؤمنون" قطعی طور پر ثابت کر رہا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب جمہور مسلمین کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے اور اسلام میں انتخابِ امیر کے لیے مثالی و معیاری اور افضل و اولیٰ طریقہ یہی ہے۔ چنانچہ حضورؐ کے اس منشا کو امت نے ٹھیک ٹھیک پورا کیا اور انہی حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا جنہیں حضورؐ پسند فرماتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ تھے جن کا تقرر و استخلاف بلاشبہ حضرت ابوبکرؓ کی تجویز کے مطابق عمل میں لایا گیا تھا اور اسی سے بعض حضرات یزید کی ولی عہدی اور بعد کی نسلی و خاندانی حکمرانی کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک پر دوسری صورت کو قیاس کرنا بالکل غلط ہے، کیونکہ دونوں میں فرق و امتیاز کے متعدد پہلو بالکل بیّن اور نمایاں ہیں۔ مثلاً پہلا فرق یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں کوئی ولی عہد مقرر کر کے اس کی بیعت نہیں لے لی بلکہ ان کو اپنا جانشین تجویز کرنے کا خیال اس وقت آیا جبکہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اپنے آخری ایامِ مرض میں کئی

روز تک آپ مسجد میں نماز کے لیے بھی تشریف نہ لے جاسکے اور جس وقت آپ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت لکھوانی شروع کی تھی اس وقت آپ اتنے ضعیف و نحیف ہو چکے تھے کہ املا کراتے کراتے آپ کچھ دیر کے لیے بیہوش ہو گئے۔ اس کے برعکس یزید کی ولی عہدی کی تحریک اور مہم کا آغاز حضرت امیر معاویہؓ کی وفات سے چار سال بلکہ اس سے بھی قبل (۵۱ھ میں) ہو چکا تھا۔ یہ تحریک صرف شام تک محدود نہ تھی بلکہ مروان اور زیاد وغیرہ نے اسے حرمین، بصرے، کوفے میں پوری سرگرمی سے شروع کر رکھا تھا اور تمام لوگوں سے باقاعدہ بیعت لی جا رہی تھی۔ اسی صورتِ حال کو دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عمر جیسے محتاط اور مرنجاں مرنج انسان نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایک وقت میں دو بیعتوں کا قلادہ اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا۔ البتہ امیر معاویہؓ کے بعد جو بھی خلیفہ تسلیم کر لیا جائے گا، میں اس کی بیعت کر لوں گا۔

دوسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تحریر لکھوانے سے چند روز پہلے اربابِ حل و عقد اور اصحابِ شوریٰ سے پوری طرح مشورہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ابن سعد صاحبِ طبقات نے آپ کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر میں ذکر وصیۃ ابی بکر کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ آپ نے حضرات عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عثمانؓ، سعید بن زیدؓ، ابو الاعورؓ، اسیدؓ بن حضیر اور متعدد دیگر مہاجرین و انصار سے مشورہ لیا اور سب نے حضرت عمرؓ کے حق میں اچھی رائے کا اظہار کیا۔ پھر بعض لوگوں نے جب حضرت عمرؓ کی سختی کا ذکر کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں اپنے اللہ سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بہترین آدمی کو تجویز کیا ہے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ عمر میری نرمی کے بل پر سخت ہو جاتے تھے، اب جب میری جگہ خود بوجھ اٹھائیں گے تو نرم ہو جائیں گے) پھر مجمع عام میں تحریر پڑھ کر سنائی گئی اور لوگوں نے کسی دباؤ اور جبر کے بغیر برضا و رغبت اس پر اپنی منظوری کا اظہار کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں شوریٰ کا وجود اور اہلِ حل و عقد کا ادارہ عملاً ختم ہو چکا تھا اور یزید کی ولی عہدی کا معاملہ جس طرح طے کیا گیا وہ حضرت ابوبکرؓ کی وصیت سے قطعی طور پر مختلف تھا جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

تیسری بات جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مابین خاندانی قرابت کا کوئی تعلق نہیں تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وصیت کے ساتھ اس پہلو کی طرف خصوصی اشارہ فرما دیا تھا تاکہ اعتراض و تہمت کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ امام ابن جریر اپنی تاریخ (جلد ۲، ص ۶۱۸) میں فرماتے ہیں:

اشرف ابو بکر علی الناس من کنیفه و

حضرت ابوبکرؓ نے دریچے میں سے لوگوں کی طرف جھانکا

اسماء ابنة عميس ممسكته وهو يقول اترضون بمن استخلف عليكم؟ فانی واللہ ما الوت من جهد الرأی ولا وليت ذا قرابة و انی قد استخلفت عمر بن الخطاب فاسمعوا له واطيعوا فقالوا سمعنا و اطعنا۔

جبکہ (آپ کی اہلیہ، حضرت اسماء بنت عمیس نے آپ کو تھام رکھا تھا۔ آپ فرما رہے تھے کہ کیا تم لوگ میرے جانشین پر راضی ہو؟ خدا کی قسم میں نے غور و خوض میں کمی نہیں کی اور میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو ولایت نہیں سونپی۔ میں نے عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ تجویز کیا ہے پس سنو اور مانو۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔

اس کے برخلاف امیر معاویہؓ نے اپنے قریب ترین عزیز یعنی خود اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا کر ایک ایسی مثال قائم کی جو پہلے موجود نہ تھی، لیکن جو بعد والوں کے لیے دائمی طور پر ایک نظیر اور دلیل بن کر رہی۔ ابن اثیر فرماتے ہیں: معاوية اول خليفة بايع لولده فی الاسلام (معاویہؓ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے اسلام میں اپنے بیٹے کے لیے بیعت لی، الکامل ج ۳ ص ۲۶۳)۔ اس کے بعد مسلمانوں میں بیعت کا انتخابی اور شورائی طریقہ بالکل معدوم ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک حکمران نے اپنے بعد علی الترتیب دو دو، تین تین ولی عہد مقرر کرنے شروع کر دیئے جن میں سے بعض نابالغ بلکہ ماں کے پیٹ میں ہوتے تھے اور ان کے حق میں زبردستی بیعت لی جاتی تھی۔ پھر بیعت کے فارمولوں میں بیعت کرنے والے سے یہ الفاظ کہلوائے جاتے تھے کہ اگر میں بیعت فسخ کروں گا تو میری بیوی پر طلاق مغلظ وارد ہو گی۔ یہی بیعتِ مکرہ اور طلاقِ مکرہ تھی جس کے خلاف امام مالکؒ نے اپنی جان پر کھیلتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی تھی اور فرمایا تھا کہ یہ کوئی شے نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کی باری آتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق بعض اوقات یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے استخلاف کے معاملے میں اپنے دونوں پیش روؤں کے بین بین ایک تیسرا مختلف طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ آپ نے کسی فردِ واحد و متعین کو جانشین تجویز کرنے کے بجائے ایک شورٰی یا انتخابی کونسل تشکیل کر دی تاکہ وہ خلیفہ کا نام تجویز کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت عمرؓ کا طریقِ استخلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے زیادہ مشابہ ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب الاستخلاف میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو لوگوں نے آپ کو جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے متردد ہو کر فرمایا کہ اگر میں جانشین تجویز کروں تو یہ بھی ایسے شخص کا کام ہے جو مجھ سے بہتر تھا (یعنی حضرت ابوبکرؓ) اور اگر میں تمہیں اسی طرح چھوڑ دوں تو ایسا عمل بھی انہوںؐ نے فرمایا تھا، جو مجھ سے بہتر تھے (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو

خود اپنے والد ماجد کا انداز بیان دیکھ رہے تھے فرماتے ہیں:

فعرفت انہ حین ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مستخلف	میں نے جان لیا کہ جب آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر رہے ہیں تو پھر آپ کسی فردِ واحد کو خلیفہ تجویز نہیں کریں گے۔

اس کے معًا بعد مسلم کی دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ حضرت حفصہؓ کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے والد کسی کو جانشین نہیں بنا رہے"؟ حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ فرمانے لگیں کہ وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے قسم اٹھائی کہ وہ اس معاملے میں حضرت عمرؓ سے بات کریں گے۔ ایک دن تو حضرت ابن عمرؓ بات کی ہمت نہ کر سکے مگر دوسرے روز آپ نے عرض کیا کہ "لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی کو جانشین نہیں تجویز کر رہے۔ اگر آپ کا کوئی چرواہا ہو اور وہ اپنے گلے کو اس کے حال پر چھوڑ کر آجائے تو آپ دیکھ لیں گے کہ اس نے گلہ ضائع کر دیا۔ مسلمانوں کی نگہبانی کا معاملہ تو شدید تر ہے۔" حضرت عمرؓ نے اتفاق کیا، کچھ دیر اپنا سر ٹیکے رہے، پھر حضرت ابن عمرؓ کی طرف متوجہ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا ذکر کرتے ہوئے وہی کچھ فرمایا جو اوپر کی روایت میں مذکور ہے۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

فعلمت انہ لم یکن لیعدل برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احداً وانہ غیر مستخلف	پس مجھے معلوم ہو گیا کہ حضرت عمرؓ کسی کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر جاننے والے نہیں ہیں اور آپ کسی کو خلیفہ نہیں بنائیں گے۔

ان روایات اور بالخصوص حضرت ابن عمرؓ کی تشریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس معاملے میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو اپنے سامنے رکھا ہے اور شخص متعین کے استخلاف سے اسی بنا پر اجتناب کیا ہے۔ البتہ آپ نے خلافت کے لیے نام تجویز کرنے کا کام ایسے اصحاب کے سپرد کر دیا جو عشرۂ مبشرہ میں شامل تھے اور اسلامی معاشرے کے کلہاتے سر بَسَد اور سربرآوردہ ترین اشخاص شمار ہوتے تھے۔ عشرۂ مبشرہ میں سے دو (حضرت ابو بکرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ) جنت کے مکین ہو چکے تھے، تیسرے خود (حضرت عمرؓ) جنت جانے کے لیے پابرکاب تھے۔ باقی سات اصحاب بقید حیات تھے جن میں سے چھ کو آپ نے انتخابی بورڈ کا رکن بنا دیا مگر ساتویں (حضرت سعیدؓ ابن زید) کو آپ نے مستثنیٰ کر دیا، صرف

اس بنا پر کہ وہ آپ کے چچا زاد بھائی اور بہنوئی تھے، ورنہ وہ حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ قدیم الاسلام اور سابق الایمان تھے۔ یہ فقط میرا ہی قیاس نہیں ہے، بلکہ متعدد علمائے سلف نے یہی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے انہیں بربنائے تورّع و تقویٰ الگ رکھا کیونکہ وہ اُن کے قرابت دار تھے۔ صحیح مسلم کی جن روایات کو اُوپر نقل کیا گیا ہے، اُن سے ملتی جلتی ایک روایت مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب نہی من اکل الثوم میں بھی موجود ہے جس میں حضرت عمرؓ کے ایک خواب کا ذکر ہے جس کی تعبیر یہ سمجھی گئی تھی کہ آپ کی موت کا وقت قریب ہے۔ آپ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ مجھے جانشین بنانے کے لیے کہتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اس حدیث کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

الستۃ عثمان وعلی وطلحۃ والزبیر وسعد بن ابی وقاص وعبد الرحمٰن بن عوف و لم یدخل سعید بن زید معھم وان کان من العشرۃ لانہ من اقاربہ فتورع عن ادخالہ کما تورع عن ادخال ابنہ عبد اللہ رضی اللہ عنہم۔

جن چھ اصحاب کے نام حضرت عمرؓ نے تجویز کیے تھے، وہ عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد ابن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم تھے اور انہوں نے ان میں حضرت سعید بن زید کو شامل نہیں کیا حالانکہ وہ بھی عشرۂ بشرہ میں سے تھے، کیونکہ وہ ان کے اقارب میں سے تھے پس آپ نے انہیں شوریٰ میں داخل نہیں فرمایا جیسا کہ آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کو بھی نہیں شریک کیا۔

اسی طرح بخاری، کتاب الحدود والمحاربین، باب رجم الحبلیٰ من الزنا میں ایک مفصل حدیث وارد ہے کہ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ میں عمرؓ کے بعد فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر غضبناک ہوگئے اور فرمایا کہ میں ایسے لوگوں کو سخت تنبیہ کروں گا۔ پھر فرمایا:

ھٰؤلاءِ الذین یریدون ان یغصبوھم امورھم ... ولیس منکم من تقطع الاعناق الیہ مثل ابی بکر من بایع رجلاً غیر مشورۃ من المسلمین فلا یبایع ھو ولا الذی بایعہ تغرۃ ان یقتلا۔

یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ عامۃ الناس کے حقوق غصب کریں ... تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ابوبکر کی طرح مرجع عوام ہو۔ جس نے بھی مسلمانوں سے مشورے کیے بغیر بیعت کی، اس بیعت کرنے کرانے والے کا فعل قابلِ قبول نہیں ہے، بلکہ وہ دونوں اپنے آپ کو قتل

کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابن عمرؓ کو بھی انتخابی کونسل میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ مبصر کی حیثیت سے موجود رہیں مگر خلافت میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہوگا۔ میرے خاندان میں اگر عمرؓ برابر سرابر چھوٹ جائے تو غنیمت ہے۔ بخاری، فضائلِ اصحاب میں حضرت عمرؓ کا ارشاد یوں نقل ہوا ہے:

یشهدکم عبد الله بن عمر ولیس له من الامر شیئ ۔	تمہاری مجلس میں عبداللہ بن عمرؓ حاضر تو رہیں گے مگر امارت میں سے انہیں کچھ نہ ملے گا۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

اما سعید بن زید فهو ابن عم عمر فلم یسمه عمر فیهم مبالغة فی التبری من الامر	سعیدؓ بن زید حضرت عمر کے چچا زاد بھائی تھے، پس عمرؓ نے ان کا نام نہ لیا۔ یہ امارت کی ذمّہ داری سے برادت میں مبالغہ و شدت کی بنا پر تھا۔

اسی مقام پر المدائنی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

عدّ عمر سعید بن زید فیمن توفی النبی صلی الله علیه وسلم وهو عنهم راض الا انه استثناه من اهل الشوریٰ لقرابته منه ۔	حضرت عمرؓ نے حضرت سعید بن زید کو ان اصحاب میں شمار کیا جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بوقت وصال راضی تھے مگر حضرت عمرؓ نے انہیں اہلِ شوریٰ سے مستثنیٰ کر دیا۔ کیونکہ وہ آپ کے رشتہ دار تھے۔

امام ابن تیمیہؒ منہاج السُّنّہ، جلد ۳، ص۱۶۸ پر فرماتے ہیں:

وعمر قد اخرج من الامر ابنه ولم یدخل فی الامر ابن عمه سعید بن زید وهو احد العشرة وهم من قبیلة بنی عدی ۔	اور حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ اور اپنے عم زاد سعید بن زید کو امید وارئ امارت سے خارج کر دیا حالانکہ سعیدؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ قبیلۂ بنی عدی کے افراد تھے۔

اس کے متصلاً بعد ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے قبیلے میں سے کسی کے سپرد کوئی عہدہ نہیں کیا۔ صرف ایک مرتبہ ایسا کیا مگر بعد میں اس والی کو بھی معزول کر دیا۔ یہی بات اس کتاب کے صفحہ ص۱۳۰، ج ۴ پر بیان

کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اپنی زندگی میں اپنے کسی عزیز کو منصب نہیں سونپا، نہ اُسے اپنے بعد جانشین بنایا، حالانکہ ان کی اولاد و اقارب میں فضلائے صحابہ موجود تھے۔

حضرت عمرؓ نے جو انتخابی شوریٰ مقرر کی تھی اس کے ارکان نے باہمی گفت و شنید کے بعد خلیفہ تجویز کرنے کا کام حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو تفویض کر دیا تھا۔ تاریخ طبری اور دوسری کتابوں میں جو تفصیلات درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن نے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ رائے عام کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ آپ نے گھروں میں جا کر پردہ نشین خواتین تک سے مشورہ لیا۔ مدینے کے باشندوں، طالب علموں اور باہر آنے جانے والے حاجیوں کی رائے معلوم کی۔ آخر کار انہیں اندازہ ہوا کہ لوگ حضرت عثمان کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ ہی کے ہاتھ پر بیعت عام ہوئی۔

حضرت عثمانؓ اپنے خاندان بنو امیہ کے حق میں فیاض تھے۔ آپ کا یہ قول مُسند احمد اور دوسری کتابوں میں منقول ہے کہ اگر میرے پاس جنّت کی کنجی ہو تو میں اپنے خاندان کے آخری فرد تک کو دے دیتا کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے[1] آپ کے خاندان کے بعض افراد نے محاصرے میں آخر دم تک آپ کا ساتھ دیا۔ مگر اس کے باوجود حضرت عثمانؓ نے بھی اپنے خاندان کے کسی فرد کے حق میں استخلاف کی وصیت نہیں فرمائی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بعض صحابۂ کرامؓ حضرت علیؓ کے ہاں جمع ہوئے اور ان سے بیعت کرنی چاہی مگر حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔ جب آپ سے بار بار تقاضا کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر میری خلافت پر اتفاق کا اظہار نہ کریں، اس وقت تک میری خلافت منعقد نہیں ہو سکتی۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۴۵۰ میں آپ کا یہ قول بھی منقول ہے:

فان بیعتی لا تکون خفیا ولا تکون الا عن رضا المسلمین۔	میری بیعت مخفی طریق پر نہیں ہو سکتی، اس کے لیے مسلمانوں کی رضائے عام لازم ہے۔

پھر آپ نے سب لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع ہونے کا مشورہ دیا اور مہاجرین و انصار صحابہؓ کی اکثریت نے آپ سے بیعتِ خلافت کی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے موقع پر جب آپ کی وفات کا وقت آ پہنچا تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا

---

[1] مُسند احمد، مرویاتِ عثمان میں ہے:

قال عثمان، لو ان بیدی مفاتیح الجنۃ لاعطیتھا بنی امیۃ حتی یدخلوا من عند آخرھم۔

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی جاتے ؟ آپ نے جو جواب دیا وہ طبری (ج ۴، ص ۱۱۲) میں درجِ ذیل الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

ما آمرکم ولا انھاکم - انتم ابصر — مَیں نہ تمہیں اس بارے میں کوئی حکم دیتا ہوں، نہ منع کرتا ہوں۔ تم خود مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو

چنانچہ حضرت علیؓ کے بعد جن لوگوں نے حضرت حسنؓ سے بیعت کی تھی اور جو حضرت معاویہؓ کے خلاف جنگ کے لیے نکلے تھے، ان سب نے حضرت حسنؓ کو بطیب خاطر اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ منتخب کیا تھا، اس میں حضرت علیؓ کی کسی خواہش یا ہدایت کو کوئی دخل نہ تھا۔

یہ ہے رئیسِ مملکتِ اسلامی کے تقررؑ کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کا تعامل اور صحابہ کرام کا اجماعی طرزِ عمل - اس مستند دستوری رواج سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہے وہ یہ کہ خلیفۃ المسلمین کا انتخاب عوام الناس کی مرضی پر موقوف و منحصر ہے اور کسی شخص کا بزور خلیفہ بننے کی کوشش کرنا اور پھر اپنے کسی قریبی عزیز کے حق میں جانشینی کا فیصلہ کر کے اپنی زندگی میں اس کی بیعت لے لینا کوئی مستحسن اور پسندیدہ فعل نہیں ہے علماء کا اجماع اگر ہوا ہے تو اس بات پر ہوا ہے کہ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے اور اس کو بدلنے کی کوشش موجبِ فتنہ ہوتی نظر آئے تو اسے برداشت کر لینا چاہیے، اور اس طرح بھی خلافت منعقد ہو جاتی ہے۔ مگر اس بات پر اجماع ہرگز نہیں ہوا ہے کہ اسلام میں یہ بالکل جائز و مباح طریقہ ہے اور خلافت خواہ شوریٰ اور انتخاب سے ہو، یا اس دوسرے طریقہ پر، دونوں اسلام کی نگاہ میں یکساں ہیں - اس مسئلے پر مفصل بحث آگے چل کر ہو گی۔

تصحیح نیت کی بحث | اس اصولی و تمہیدی کلام کے بعد اب میں مولانا مودودی کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جسے مولانا عثمانی صاحب نے سب سے پہلے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ وہ عبارت "خلافت و ملوکیت" ص ۱۰۵ پر ان الفاظ میں درج ہے :

"یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہؓ بن شعبہ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔"

اس پر مولانا محمد تقی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ "جمہور اُمت کے محقق علماء ہمیشہ سے یہ تو کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہُوا اور اس کی وجہ سے اُمت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا مگر حضرت معاویہؓ کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔" اس کے جواب میں میری پہلی گزارش یہ ہے کہ مولانا عثمانی نے مولانا مودودی کے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے محتاط الفاظ اور ملائم اندازِ بیان کو خواہ مخواہ سخت اور ناگوار الفاظ میں بدل دیا ہے۔ کسی کام کا صحیح جذبے کی بنیاد پر نہ ہونا اور کام کرنے والے کا نیک نیت نہ ہونا یا اس کی نیت کا متہم ہونا دونوں صورتیں یکساں نہیں ہیں۔ اسی طرح کسی فرد کا ذاتی مفاد سے اپیل کرنا اور کسی فرد کا مفاد پرست ہو جانا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ مَیں کہوں کہ بعض صحابہ کرام سے سرقہ، شُربِ خمر یا زنا کا صدور بھی ہوا ہے اور عثمانی صاحب میرا قول یوں نقل کر دیں کہ صحابہ کرام چور، شرابی، زانی اور عیش پرست تھے۔ یا عثمانی صاحب یہ فرمائیں کہ مسلمانوں سے شرک و بدعت کا صدور ہو رہا ہے اور مَیں ان کی بات کو یوں نقل کروں کہ مسلمان عام طور پر مُشرک اور مبتدع بن چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔

تاہم اگر جذبے اور نیت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے اور کسی کام کے صحیح جذبے پر مبنی نہ ہونے کا مطلب تصحیح نیت کا فقدان ہی لے لیا جائے تب بھی ایک بنیادی سوال جو اس ضمن میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ نیت کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا لحاظ و اعتبار ہر انسانی فعل میں ہے یا کچھ خاص قسم کے افعال ہیں جن میں نیت کی صحت و عدمِ صحت معتبر ہے اور جن میں نیت کے فساد و صلاح کے مختلف عواقب و اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مَیں نے اپنی حد تک اس مسئلے پر غور کیا ہے اور محدثین نے انما الاعمال بالنیات اور لکل امریٔ ما نوی وغیرہ احادیث کی تشریح میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اس معاملے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ نیت کے وجود و عدم یا صحت و سقم کا سوال صرف اُن اعمال کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جو عبادات و تقربات سے متعلق ہوں یا کم از کم شریعت کے اوامر و نواہی کی تعمیل کرتے ہوئے انجام پذیر ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اگر نماز پڑھے یا زکوٰۃ دے یا حج کرے یا جہاد فی سبیل اللہ میں جانی و مالی قربانی دے تو ان میں نیت کا موجود یا مفقود ہونا اور اس کا صحیح یا غلط ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ہر پہلو سے قابلِ اعتبار

رہے، کیونکہ ایسے افعال میں نیت کی اچھائی یا برائی سے آسمان و زمین کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو فعل جو نظر بظاہر یکساں ہوں، ان میں سے ایک پر جنت واجب ہو اور دوسرا بالکل اکارت جائے، بلکہ اُلٹا موجبِ مواخذہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان افعال کے معاملے میں ہمیں حسنِ ظن کی تلقین کی گئی ہے اور زیادہ قیاس آرائی سے روکا گیا ہے، اگرچہ صریح شواہد و قرائن کی بنا پر نیت کو زیر بحث لانا قطعاً ممنوع بھی نہیں ہے۔

وہ امور جو عبادات کی قبیل سے نہیں ہیں اور جن کا مشروع اور مامور بہ ہونا کتاب و سنت سے ثابت نہیں ہے، بلکہ جو شریعت کی رُو سے غلط یا غیر مستحسن قرار پاتے ہیں، ان میں نیت یا جذبے کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس طرح کے افعال جب زیر بحث آتے ہیں تو ناگزیر طور پر وہ ارادہ اور جذبہ بھی زیر بحث آ جاتا ہے جس کے تحت وہ افعال سرانجام پاتے ہیں۔ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ اس طرح کے محلِ نظر اعمال جب موضوعِ سخن بنتے ہیں تو ان کے حُسن و قُبح پر بحث کے دوران میں وہ جذبہ و مُحرّک بھی لامحالہ کسی نہ کسی حد تک بیان میں آ ہی جاتا ہے جو ان میں کارفرما ہوتا ہے اور جو عملی رویّے سے صاف طور پر مترشح ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح کے اعمال میں اگر جذبات و محرکات کا ذکر آ جائے تو ذکر کرنے والے کا مُنہ یہ کہہ کر بند نہیں کیا جا سکتا کہ تم نیت پر حملہ کر رہے ہو جس کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ اگر غلط فعل کو غلط جذبے پر مبنی قرار دینے کا نام "نیت پر حملہ" ہے اور گناہ ہے تو پھر کسی دینی، علمی یا تاریخی موضوع پر کلام کرنے والا شاید ہی کوئی مسلمان ہو گا جو اس سے بچ سکا ہو۔ مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اب تک جو کچھ سپردِ قلم کرتے رہے ہیں اگر اس پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال لیں تو انہیں اس میں بھی اس چیز کے متعدد نمونے مل جائیں گے جسے وہ "نیتوں پر حملہ" قرار دے کر ممنوع ٹھیرا رہے ہیں۔ انسانی فعل اور مشینی حرکت میں آخر کچھ تو فرق ہوتا ہے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فعلِ نامحمود بالعموم جذبۂ نامحمود ہی کا ثمرہ ہوتا ہے۔

اس سے پہلے میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے اقوال نقل کر چکا ہوں جن میں انہوں نے فرمایا ہے کہ امیر معاویہؓ کی بعض کارروائیاں خاندانی عصبیت سے مُبرّا نہ تھیں۔ حضرت سعدؓ بن عُبادہ اور ابو سفیانؓ کے متعلق بھی میں ابن تیمیہؒ کے اقوال درج کر چکا ہوں، اور بہت سے دیگر اقوال بزرگانِ سلف کے پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے بعض صحابہ کرام کے رویّے پر ایسے الفاظ میں تنقید کی ہے جن کی زد جذبات و محرکات پر بھی لازماً پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر حافظ ابن عساکرؒ، حضرت فُضیلؒ بن عیاض کا ایک قول روایت کرتے

ہیں جسے ابن کثیرؒ نے البدایہ جلد ۸ ص ۱۴۰ پر بھی نقل کیا ہے۔ قول یہ ہے:

معاویۃ من الصحابۃ، من العلماء الکبار ولکن ابتلی بحبّ الدنیا۔

معاویہؓ صحابی اور علمائے کبار میں سے ہیں لیکن وہ حبِ دنیا میں مبتلا ہو گئے۔

اب مولانا عثمانی اگر چاہیں تو فرما سکتے ہیں کہ یہ امیر معاویہؓ پر دنیا پرستی کا الزام ہے اور ان کی نیت پر حملہ ہے جس کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ لیکن عثمانی صاحب کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ حضرت فُضیل ایک طرف ایسے صاحبِ تقویٰ و تورّع تھے کہ وہ صوفیائے کرام کے امام شمار کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ اتنے ثقہ اور صادق القول ہیں کہ صحیحین، سُنن اور مُسندِ شافعیؒ سب میں ان کی روایات موجود ہیں۔

مولانا وحید الزمان صاحب حیدر آبادی نے تیسیر الباری (ترجمہ و تشریح البخاری) کے متعدد مقامات پر امیر معاویہؓ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا دل اہلِ بیت سے صاف نہ تھا جس طرح شاہ عبد العزیزؒ نے لکھا ہے کہ "حرکاتِ اُو خالی از شائبہ نفسانی نبود" یہ الفاظ بظاہر بہت سخت ہیں اور ممکن ہے کہ مولانا محمد تقی صاحب ان کو بھی "نیت پر حملہ" قرار دیں۔ لیکن ان الفاظ کو نیت پر حملہ کہہ کر ان کا زبان و قلم سے صدور ممنوع سمجھنا اس وجہ سے درست نہیں کہ تاریخ و حدیث کی کتابوں میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں جو اسی صورتِ حال پر صاف صاف دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت علیؓ و آلِ علیؓ پر سب و شتم ہی کے مسئلے کو لیجیے۔ یہ مذموم طریقہ جس طرح حضرت علیؓ کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد تک جاری رہا اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے مدینہ منتقل ہو جانے پر جس طرح امیر معاویہؓ کا گورنر مروان ان کے رُو در رُو خطبوں میں ان پر لعن طعن کرتا تھا، اس کے بعد آخر دلوں کی صفائی کیسے باقی رہ سکتی تھی؟ پھر یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد بھی ان کی طرف سے امیر معاویہؓ اپنی طبیعت میں خلش محسوس کرتے تھے جو امام حسنؓ کی وفات ہی پر رفع ہوئی۔ ابو حنیفہؒ دینوری الاخبار الطوال ص ۲۲۲ پر لکھتے ہیں۔

وانتھی خبر وفاۃ الحسن الی معاویۃ، کتب بہ الیہ عاملہ علی المدینۃ مروان فارسل الی ابن عباس وکان عندہ بالشام فعزاہ واظھر الشماتۃ بموتہ فقال لہ ابن عباس لاتشمتن بموتہ فواللّٰہ لا تلبث بعدہ

حضرت حسنؓ کی وفات کی خبر امیر معاویہؓ کے عاملِ مدینہ مروان نے ان تک پہنچائی۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو بلایا جو ان کے پاس شام میں آئے ہوئے تھے پس امیر معاویہؓ نے ان سے اظہارِ ہمدردی کیا اور امام حسنؓ کی وفات پر خوشی ظاہر کی۔ اس پر ابن عباسؓ نے ان سے

الّا قلیلاً۔

کہا کہ آپ ان کی موت پر خوش نہ ہوں۔ خدا کی قسم آپ بھی ان کے بعد زیادہ دیر زندہ نہ رہیں گے۔

اس کے بعد سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی جلود النمور کی درج حدیث ملاحظہ ہو:

وفد المقدام بن معدیکرب الی معاویۃ بن ابی سفیان فقال معاویۃ للمقدام اعلمت ان الحسن بن علی توفی فرجّع المقدام فقال له فلان اتعدّها مصیبۃ۔ فقال له ولِمَ لا اراها مصیبۃ وقد وضعه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی حجرہ فقال ھٰذا منی وحسین من علیّ۔ فقال الاسدی جمرۃ اطفاھا اللّٰه۔

مقدام بن معدیکرب حضرت معاویہؓ کے پاس آئے تو حضرت معاویہؓ نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہوا ہے کہ حسنؓ فوت ہو گئے ہیں؟ مقدامؓ نے کہا انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ ایک شخص (مراد امیر معاویہؓ ہیں) نے کہا کہ کیا آپ اسے ایک مصیبت قرار دے رہے ہیں؟ مقدام کہنے لگے کہ میں ان کی وفات کو کیوں مصیبت نہ سمجھوں حالانکہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی گود میں بٹھایا اور فرمایا کہ یہ میرا ہے اور حسینؓ علیؓ کا ہے۔ قبیلہ بنو اسد کے فرد نے (جو حضرت مقدام کے ہمراہ تھا) کہا کہ حسنؓ ایک انگارہ تھا جسے اللہ نے بجھا دیا۔

اس روایت میں جہاں فلاں کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں مُسند احمد میں معاویہ کا لفظ مروی ہے، جیسا کہ مولانا شمس الحق صاحبِ عون المعبود نے تصریح کر دی ہے۔ اس روایت کی تشریح میں مولانا موصوف فرماتے ہیں:

والعجب کل العجب من معاویۃ فانه ما عرف قدر اھل البیت حتی قال ما قال۔ فان موت مثل الحسن بن علی رضی اللّٰه عنه فی اعظم المصائب وجزی اللّٰه المقدام ورضی عنه فانه ما سکت عن تکلم الحق حتی اظھرہ وھکذا شان المومن الکامل المخلص.... فقال الاسدی طلبا لرضاء معاویۃ وتقربًا الیه۔ انما قال الاسدی ذالک القول الشدید السخیف لان معاویۃ رضی

امیر معاویہؓ کے اس قول پر انتہائی تعجب ہے۔ انہوں نے اہلِ بیت کی قدر نہ پہچانی حتیٰ کہ ایسی بات کہہ دی۔ حسن بن علی رضی اللّٰہ عنہ کی وفات یقیناً بہت بڑی مصیبت تھی اور اللّٰہ حضرت مقدام کو جزائے خیر دے اور ان سے راضی ہو کہ انہوں نے کلمۂ حق ادا کرنے میں خاموشی اختیار نہ کی اور اسے علانیہ کہہ دیا۔ مومن کامل و مخلص کی یہی شان ہے۔ بنو اسد کے شخص نے جو کچھ کہا وہ معاویہؓ کی رضا اور تقرب حاصل کرنے کے لیے تھا۔ اُس نے یہ سخت گھٹیا بات اس وجہ سے

الله عنه كان يخاف على نفسه من زوال الخلافة — امیر معاویہؓ کے سامنے کہی تھی کہ (امام حسنؓ کی موجودگی میں) امیر معاویہؓ کو اپنی خلافت کے زوال کا خوف تھا۔

یہی المعاط مولانا خلیل احمد صاحب نے بذل المجہود (شرح سنن ابی داؤد) میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے درج فرماتے ہیں۔ وہ بھی لکھتے ہیں:

فقال الاسدی طلبًا لرضاء معاویة وتقربًا اليه فقال المقدام حين سمع ما قال فی ابن بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم لمعاوية اما انا فلا ابرح اليوم حتى اغيظك واسمعك فيه ما تكره كما اسمعتني ما اكره۔

اسدی نے یہ بات معاویہؓ کی رضا اور تقرب حاصل کرنے کے لیے کہی تھی، جب حضرت مقدامؓ نے اس شخص کی بات سنی جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے امیر معاویہؓ کی خاطرداری کے لیے کہی تھی، تو حضرت مقدامؓ امیر معاویہؓ سے کہنے لگے کہ میں یہاں سے آج ہرگز نہ ہلوں گا جب تک آپ کو غصہ نہ دلاؤں اور آپ کو ایسی بات نہ سناؤں جو آپ کو ناپسند ہو جس طرح کہ آپ نے مجھے ایسی بات سنائی جو مجھے پسند نہیں۔

حدیث میں آگے بیان ہے کہ حضرت مقدامؓ نے حضرت معاویہؓ کو قسم دلا کر پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کا زیور اور ریشم پہننے سے منع نہیں فرمایا اور خدا کی قسم یہ چیزیں آپ کے گھر کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی شرح میں صاحب عون المعبود فرماتے ہیں:

فان ابناءك ومن تقدر عليه لا يحترزون عن استعمالها وانت لا تنكر عليهم وتطعن في الحسن۔

آپ کے لڑکے اور گھر کے مرد (یزید وغیرہ) ان اشیا کے استعمال سے پرہیز نہیں کرتے اور آپ ان پر نکیر نہیں کرتے۔ اور ادھر آپ حضرت حسنؓ پر طعن کرتے ہیں۔

تاریخ و حدیث کی یہ روایات اور ان کی تشریح میں جو کچھ کہا گیا ہے، شاید مدیر "البلاغ" کے نزدیک یہ سب نیتوں پر حملے کے مترادف ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے نیت پر حملے کا نام دے کر شرعاً ممنوع قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت ان میں نیت نہیں بلکہ ایک طرزِ عمل زیر بحث لایا گیا ہے جو غیر مستحسن اور نامناسب تھا۔ ظاہر ہے کہ جب عمل پسندیدہ نہیں تھا تو جس جذبے یا جس نیت پر یہ عمل مبنی ہوگا، وہ جذبہ اگر ضمناً بحث میں آجائے اور اس جذبے کو غلط یا ناپسندیدہ بھی کہہ دیا جائے تو اس سے کیا قباحت لازم آتی ہے؟ اگر

یہ پابندی لگادی جائے کہ کسی غلط یا قابلِ اعتراض قول و فعل کی غلطی واضح کرتے ہوئے اُس جذبہ و ارادہ کی جانب مطلقاً کوئی اشارہ ہی نہ ہو جو اس قول و فعل کے پیچھے کارفرما ہے، تو اس کے دوسرے معنی تو یہ ہیں کہ پھر غلطی کو غلطی ہی نہ کہا جائے۔ غلط کام کی عدمِ صحت کو جب بھی بیان کیا جائے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک اس کا محرک بھی آپ سے آپ بیان ہو گا۔ اس سے مفر ممکن ہی نہیں ہے تاہم میں سمجھتا ہوں کہ مولانا مودودی نے حضرت معاویہؓ یا دوسرے صحابہ کرام کے جس قول و فعل سے بھی کتاب و سنت کی روشنی میں اظہارِ اختلاف کیا ہے مؤدب الفاظ اور محتاط انداز میں کیا ہے۔ براہِ راست ان حضرات کی نیت کو زد میں لاتے ہوئے انہیں "بدنیت یا مفاد پرست" جیسے گستاخانہ القاب سے ہرگز ملقب نہیں کیا۔ یہ مدیرؔ "البلاغ" کی صریح دھاندلی ہے کہ وہ عامۃ المسلمین کو متوحش کرنے کے لیے اس طرح کے الفاظ گھڑ کر مولانا مودودی کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں مولانا مودودی کی درج ذیل عبارت پیش کرتا ہوں جو انہوں نے خلافت و ملوکیت ص ۳۴۴ پر درج کی ہے:

"جن حضرات نے بھی قاتلینِ عثمانؓ سے بدلہ لینے کے لیے خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھائی ان کا یہ فعل شرعی حیثیت سے بھی درست نہ تھا اور تدبیر کے اعتبار سے بھی غلط تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہے کہ انہوں نے یہ غلطی نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے کی تھی مگر میں اسے محض غلطی سمجھتا ہوں۔ اس کو "اجتہادی غلطی" ماننے میں مجھے سخت تامل ہے۔"

کیا کوئی انصاف پسند اہلِ علم جو خواہ مخواہ سُوئے ظن میں مبتلا نہ ہو، یہ کہہ سکتا ہے کہ مولانا مودودی کا یہ موقف حدِ شرع یا حدِ ادب سے متجاوز ہے اور اس قول کا قائل قصداً کسی صحابیِ رسول کو (معاذ اللہ) بدنیت ثابت کرنا چاہتا ہے یا ان کی عدالت کو مجروح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کیا علمائے اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرام معصوم عن الخطاء ہیں، ان سے کسی غلطی کا صدور سرے سے ممکن ہی نہیں ہے اور ان کے ہر قول و فعل پر اجتہاد کا اطلاق ہوتا ہے؟

(باقی)